پروفیسر عتیق احمد صدیقی

شہیدِ آزادی

سیّد احمد شہید

۱۹۴۷ء میں ہندوستانی عوام نے غیر ملکی تسلط اور غلامی سے نجات حاصل کرکے آزادی کی فضا میں سانس لینا شروع کیا۔ یہ پرامن انقلاب تھا جو ۱۹۴۷ء میں وقوع پذیر ہوا۔ انتقال اقتیارات کا عمل بغیر کسی خون خرابے کے پورا ہوگیا۔ لیکن یہ کامیابی نہ ایک دن میں حاصل ہوئی، نہ قربانی کے بغیر، اور دنیا کا کون سا بڑا مقصد ہے جو بڑی قربانیوں کے بغیر حاصل ہوا ہو۔ اس میں بظاہر پرامن انقلاب کے پیچھے قربانیوں کی ایک طویل داستان ہے ہندوستانی عوام نے غیر ملکی استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک عرصے تک جدوجہد کی استخلاص وطن کے لئے بڑی سے بڑی قربانیوں سے دریغ نہیں کیا۔ جابر و مستبد قوتوں کے سامنے سر جھکانے کے بجائے سر کٹانے کو ترجیح دی ہزارہا لوگوں نے خوشی خوشی پھانسی کے پھندوں کو چوم لیا، سنسناتی ہوئی گولیوں کے سامنے سینہ سپر ہوگئے اور جہادِ آزادی کی شمع کو اپنے خون سے روشن کرتے رہے۔

جنگ آزادی کا وہ حصہ جو بیسویں صدی سے متعلق ہے، خون آلودہ نہیں ہے۔ اس دور میں عوام اور ان سے زیادہ خواص مغلوبیت کا شکار ہوچکے ہیں۔ اقتدار میں شرکت کے مطالبوں کے ساتھ آئینی حدود کے اندر رہ کر خود اختیاری اور آزادی کے مطالبات کئے جارہے ہیں۔ جابر قوتوں کی خون آشامی بھی ختم ہوچکی ہے صرف یہ نہیں کہ بین الاقوامی طور پر ایسے حالات پیدا ہوچکے تھے جن میں خون ریزی کی عالمی سطح پر مذمت کی جانے لگی تھی اور ہر حکومت خون ریزی سے اپنا دامن بچانے لگی تھی جبکہ یورپی ممالک میں ایسی کشمکش شروع ہوچکی تھی کہ کوئی بھی

حکومت اپنے ملک یا اپنے نوآبادیات میں خلفشار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اور اس سے بھی زیادہ سچ یہ ہے کہ خون مشرق کی ارزانی نے ان کی پیاس ہی کو ختم کر دیا تھا اور حریت پسندوں کو دبانے اور کچلنے کے لئے صرف قید و بند کی سزاؤں کو ہی کافی سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن انیسویں یا اٹھارویں صدی کی جدوجہد کی داستان خون سے رنگین ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کو پہلی جنگ آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ایسا کہنا اس سے پہلے کی تاریخ کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ آخری مسلح مقاومتی جنگ تھی، جس میں شکست کھانے کے بعد اہل ہند کے حوصلے پست ہو گئے۔ آخری مغل تاجدار کو قید کر کے جلا وطن کر دیا گیا اور مغل سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ مغل سلطنت اور مغل حکمراں جن کو ابھی تک برطانوی حکمراں ایک آلے کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور جو ابھی تک اہل ہند کے لئے مرکزیت کا نشان تھے، منظر سے ہٹا دیئے گئے، وحشت و بربریت کا ننگا ناچ ہوا اور برطانوی استبداد نے وہ مظالم ڈھائے کہ چشم آفتاب نے ان کی مثال کم دیکھی ہوگی۔ جائیدادیں ضبط ہوئیں، حویلیاں ڈھائی گئیں، بستیاں برباد کر دی گئیں، چوراہوں پر سولیاں گاڑ دی گئیں اور ہزار لوگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ کہا جاتا ہے پھانسی پانے والوں میں صرف علماء کی تعداد دس ہزار سے متجاوز تھی ۱۸۵۷ء کے اس معاریہ کو اتنی بھی زیادہ اہمیت حاصل ہوئی کہ اس وقت ہندوستان کی بہت سی چھوٹی بڑی قوتیں ایک فیصلہ کن جنگ کے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، اور اس ناکامی کے بعد ان کے پاس یاس و حسرت کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن تاریخ پر نظر ڈالئے تو ۱۸۵۷ء تک اہل ہند کو غیر ملکی تسلط کے خلاف لڑتے لڑتے ایک صدی گذر چکی تھی۔ یہ درست ہے کہ ان جنگوں کی حیثیت علاقائی تھی، لیکن خود انگریزوں کے اثرات بھی علاقائی تھے، جن سے باہر یا تو وہ تاجر تھے یا ہندوستانی ریاستوں کی آڑ میں مطلب ستانی کر رہے تھے مگر بعض عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ علاقائیت چند روزہ ہے اور اگر ان بڑھتے ہوئے اثرات کو نہ روکا گیا تو یہ عنقریب دھیرے دھیرے ساری چھوٹی بڑی ریاستوں کو نگل جائے گا۔

سراج الدولہ کی طرف سے پہلی منظم کوشش تھی کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار، ان کے ظلم و تعدی اور ان کے استحصال کو روک دیا جائے اور وہ بنگال میں اپنی حاکمیت قائم نہ کر سکیں، لیکن عیاری اور لالچ کا برا ہو کہ اس کے بہت سے امرا انگریزی رشوتوں کا شکار ہو گئے۔ میر بخشی، میر جعفر، حاکم کلکتہ مانک چند، امی چند جگت سیٹھ وغیرہ نے دغا کی اور سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں ۱۷۵۷ء میں شکست ہوئی۔ اس فتح کے بعد

انگریزوں کو نہ صرف کروڑہا کروڑ روپے لوٹ کھسوٹ میں حاصل ہوئے بلکہ ان کے لئے شمالی ہند کا مشرقی دروازہ کھل گیا۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شکست نے جنوبی محاذ کو صاف کر دیا اور اس شہید حریت کی خون آلودہ لاش کو دیکھ کر انگریز افسر خوشی سے چلا اٹھے "آج ہندوستان ہمارا ہے"۔

۱۸۰۰ء میں انگریز فوجوں نے دہلی پر یلغار کی تو دہلی کی حفاظت کے لئے مرہٹے سینہ سپر ہو گئے لیکن تمام قوتوں کو شکست دے کر لارڈ لیک کی ماتحتی میں ان فوجوں نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔ پیشوا کو اس سے پہلے ہی دبا کر معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ جس کی رُو سے انگریزوں کی ایک فوج اس کے علاقہ میں رہنے لگی تھی۔ سیندھیا کی فوجوں کو دہلی میں شکست ہو گئی۔ امیر علی خاں اور ملکہ انگریزی اقتدار پر برابر ضرب لگا رہے تھے، ان کو بھی کمزور کر دیا گیا، مگر اس وقت نہ بادشاہ کو معزول کیا گیا، نہ تاج اور تخت چھینا گیا اور نہ ہندو مسلمانوں کے معاشرتی اور مذہبی امور میں مداخلت کی گئی بلکہ ہندوؤں کے سماجی معاملات پنڈتوں کے اور مسلمانوں کے معاشرتی معاملات قاضیوں کے سپرد کر دیئے۔ بس کاروبار کے اختیارات جو ہندو یا مسلمان امراء اور وزراء کے سپرد ہوتے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے تسلیم کر لئے گئے، اسی کی تعبیر وہ فقرہ تھا جو اس دور کے پورے نظام کی تصویر پیش کرتا ہے یعنی "خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، اور حکم کمپنی بہادر"۔ اس صورت حال سے اہل قلعہ نے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا اور عوام الناس نے بھی، خواص کے بعض طبقوں کو بھی مذہب، تہذیب اور بادشاہ کے محفوظ ہونے کے پیش نظر عافیت مصالحت میں ہی نظر آنے لگی تھی۔ لیکن بعض دور اندیش حضرات جن کی دور بین نگاہیں مستقبل کی پرچھائیوں کو دیکھ رہی تھیں اور اس صورت کے عواقب کو سمجھ رہی تھیں، سخت مضطرب تھے اور بے بسی کے شدید ہیجان میں مبتلا تھے۔ اسی دوران شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے، شاہ عبدالعزیز کا وہ مشہور فتویٰ ہوا، جس میں ہندوستان کے دارالحرب قرار دیا گیا۔ ان فتاویٰ کے بارے میں مولانا سید محمد میاں رقمطراز ہیں:۔

"فتوے کی زبان مذہبی ہے کہ "دارالحرب" کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا ہے، مگر روح سیاسی ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ

(۱) قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

(۲) مذہب کا احترام ختم ہے۔

(۳) اور شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔

لہ بپن چندر: ماڈرن انڈیا (انگریزی) ص ۶۶-۶۷۔

لہذا ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کر دے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لئے حرام جانے" ۲ء

اس فتویٰ کا اثر کیا ہوا؛

"عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے حیرت میں رہ گئے تھے اور اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ مذہب کی روشنی میں فیصلہ کر سکیں کہ اس اقتدار کے مقابلہ میں ان کا طرز عمل کیا ہو۔ ان کے لئے ایک راستہ کھل گیا، جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ با ہمت جنگ جو طبقہ جا بجا اس طاقت سے وابستہ ہو گیا۔ جو اس وقت انگریزوں سے برسر پیکار تھی۔ یہ طاقت اس وقت صرف مرہٹوں کی تھی۔

چنانچہ اس دور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہو گئی۔ اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ مرہٹی علاقوں کے مسلمان مرہٹوں کی فوج میں شامل ہو کر آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے بلکہ شمالی ہند کے بھی بہت سے مسلمان ان علاقوں میں پہنچے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں شریک ہو گئے خود حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمد صاحب کو امیر علی خان سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت پر شب خون مارتے رہے" ۳ء

یہ گویا صاحب کے فتوے کی عملی تعبیر کا آغاز تھا، جس کو انجام تک پہنچانے کی کوشش میں سید احمد صاحب نے اپنے بہت سے جانباز ساتھیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔

سید احمد رائے بریلی میں ۲۹ر نومبر ۱۷۸۶ء کو پیدا ہوئے ۴ء ان کا خاندان اپنے تقدس اور بزرگی کے اعتبار سے پورے اودھ میں خاص اہمیت رکھتا تھا لیکن بچپن میں وہ رسمی تعلیم کی طرف متوجہ نہ ہو سکے صرف قرآن شریف کو ذوق و شوق سے پڑھا اور اسی سے ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھی؛

"انسان دنیا میں ذاتی اغراض میں پھنسے رہنے اور ذاتی نفع کو ملحوظ رکھنے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ منشا الٰہی انسان کی پیدائش سے صرف یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی خدمت کرے اور خدا کی مخلوق کی بہتری اور ترقی دینے میں جبلی کوشش عمل میں لا دے" ۵ء

۲ء علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۸۰ ۳ء علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۸۳

۴ء مولانا سید ابوالحسن ندوی: سیرت سید احمد شہید ص ۱۰۳ ۵ء مرزا حسرت دہلوی: حیات طیبہ ص ۲۸۹

سترہ برس کے ہوئے تو والد کا انتقال ہوگیا۔ تلاش معاش میں لکھنو پہنچے مگر وہاں کے معاشرتی حالات سے نالاں ہوکر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور دہلی پہنچ کر شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں کم و بیش دو سال رہے۔ اس دوران شاہ صاحب سے ظاہری و باطنی کمالات حاصل کئے اور پھر اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق امیر علی خان کے لشکر میں شامل ہوگئے یہ گویا ان کی پرجوش اور سپاہیانہ طبیعت کی تسکین کا سامان اور ان کی پہلی جنگی تربیت گاہ تھی۔ خانقاہی زندگی سے جنگ آزمائی کے لئے کیوں بھیج دیئے گئے؟ دہلی پر انگریزی اقتدار قائم ہوچکا تھا جس کے خلاف کرنا شاہ عبدالعزیز کے نزدیک فرض عین تھا اسی کے لئے انھوں نے سید صاحب کو تیار کیا تھا، امیر علی خاں نے معمولی سپاہی کی حیثیت سے زندگی شروع کی۔ لیکن دھیرے دھیرے انھوں نے اپنی فوج تیار کرلی تھی۔ وہ جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف مورچے لے رہی تھی۔ ان کے ساتھ شامل ہونا گویا ایک مذہبی فریضہ کو ادا کرنا تھا۔ سید صاحب نے وہاں رہ کر نہ صرف عملی زندگی کا تجربہ کیا اور جنگی تدبیروں سے واقفیت حاصل کی، بلکہ پورے لشکر میں اصلاح و تبلیغ کا کام بھی جاری رکھا لیکن جب ۱۸۱۸ء میں امیر علی خاں کو انگریزوں سے صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو سید صاحب ان کا لشکر چھوڑ کر دہلی آگئے۔ اب وہ درویش ہی نہیں تھے بلکہ ایک آزمودہ کار سپاہی بھی تھے۔ اسی دوران شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل اور داماد مولانا عبدالحی نے سید احمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ دونوں حضرات اپنے دور کے عالم اجل اور خطیب بے بدل تھے۔ علوم دینی و عقلی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے گویا سید صاحب کے رسمی علم کی تلافی ان حضرات کی شرکت سے ہوتا تھی۔ یہ بیعت صرف اخلاقی و روحانی نہ تھی بلکہ یہ انقلاب آفریں پروگرام کا آغاز تھا۔ بقول مولانا محمد میاں:

> حضرت سید احمد صاحب سے زیر قیادت ایک گروپ بنایا گیا مولانا عبدالحئی اور مولانا اسمٰعیل صاحب اس گروپ کے اہم ترین رکن اور سید صاحب کے مشیر خاص قرار دیئے گئے ان تینوں حضرات کی سب کمیٹی کے سپرد کردیا گیا۔
>
> (ا) ملک بھر میں دورہ کرکے روح انقلاب پیدا کریں (ب) رضا کار بھرتی کریں ان کو فوجی ٹریننگ دیں۔
>
> (ج) مالیہ فراہم کریں (د) دیگر ممالک سے تعلقات پیدا کریں (ہ) فوجی کارروائی۔ باضابطہ جنگ[1]

ان مقاصد کے حصول کے لئے پچیس افراد پر مشتمل قافلہ ۱۸۱۸ء میں دہلی سے روانہ ہوا اور ان آزادی کے پروانوں کے پاس دنیاوی اسباب میں سے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن خدا پر کامل یقین، مقصد کی سچی لگن، ضبط و تحمل اور قربانی و ایثار کی بے پناہ دولت ان کے پاس تھی۔ یہ دورے ملک و بیرون ملک سات سال تک جاری رہے اور سچ لوگ

[1] علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۸۳

ساتھ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔ عبیداللہ سندھی نے ان دوروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دورہ بیعت طریقت کے لئے۔ دین کی فہم، اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی تلقین اس کا خاص مقصد تھا۔ یہ دورہ ۱۸۱۹ء میں ختم ہو گیا۔ اور دوسرا دورہ بیعت جہاد کے لئے ہوا۔ ان دوروں میں طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ جسمانی مشقتوں سے لے کر فاقہ کشی تک کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ مگر جن لوگوں نے ایک مرتبہ بیعت کی، وہ ان سب کو خوشی خوشی جھیلتے رہے۔ مریدوں کے حلقے میں ذکر و مراقبے کے بجائے فنون حرب کی مشق ہونے لگی سید صاحب فرماتے تھے:

> جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے ہتھیار لگاؤ، پیٹ بھر کر کھاؤ اور ان کے استعمال کی مشق کرو۔ اس سے بہتر کوئی فقیری اور درویشی نہیں۔

اسی دوران اپنے مرشد کی ہدایت پر آٹھ سو ساتھیوں کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لئے بھی گئے یہ ایک فریضہ دینی تو تھا ہی لیکن اس کے اور بھی بہت سے مقاصد و مصالح تھے۔

(۱) اس خیال باطل کی تردید کہ اہل ہند سے فریضہ حج ساقط ہو چکا ہے۔

(۲) جماعتی تنظیم کی عملی تربیت

(۳) ایک ایسی جماعت کی تربیت جو عقیدتاً اور عملاً اسلامی سانچے میں ڈھل چکی ہو تاکہ انقلاب ان ہی کے ہاتھوں برپا ہو۔

(۴) یورپی طاقتیں نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کو زیر کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہیں، ان کے خلاف ایشیائی قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش

فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد ۱۸۲۴ء میں اپنے وطن پہنچے۔ اس دوران ہزارہا لوگوں نے بیعت کی اس سے پورے شمالی ہند میں اخلاقی و سماجی بیداری کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری اور انقلاب کی داغ بیل پڑ گئی جو لوگ اب تک بے حسی کے ساتھ حالات کا شکار تھے، اب ان کو محسوس کرنے لگے۔ جو بے بسی کے ساتھ ان کو دیکھ رہے تھے، کچھ کرنے کی لگن سے بے تاب ہو گئے، ناامیدی امید سے اور پست ہمتی حوصلہ سے بدلنے لگی۔ شاہ ولی اللہ نے جس مکمل انقلاب کا نظریہ پیش کیا تھا، اس کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے ہر طرح کی جانی و مالی قربانی کا جذبہ پیدا ہو گیا جگہ جگہ ایسے افراد تیار ہو گئے جنھوں نے تحریک انقلاب کی زمام اپنے ہاتھوں لی اور اس طرح کلکتہ سے دہلی، بلکہ پشاور تک انقلاب پسندوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ یہ نری مہم جوئی یا اقتدار پسندی نہیں تھی، اس لئے اصلاح نفس و اصلاح معاشرت کا عمل بھی جاری تھا۔ اس دوران جو فضا پیدا ہو گئی تھی، اس کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں:

> "پہلے جو چیز خواب و خیال تھی اب ان کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی تھی، جس میں انھوں نے اپنی آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اصلاحی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریزوں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا تھا"[1]

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۸۹

یہ سب زمین ہموار ہونے اور کسی حد تک سامان حرب وضرب بہم پہنچ جانے کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ آغاز کار کہاں سے ہو، کوئی ایسا مقام نقطۂ آغاز نہیں ہو سکتا تھا، جہاں ہر طرف اغیار سے گھر جائیں، کمک نہ پہنچ سکے راستے مسدود ہو جائیں، کامیابی کی صورت یہ نظر آتی تھی کہ ہندوستان کے شمال مغربی سرحد کے علاقہ کو اپنا مستقر اور مخرج کا مرکز بنایا جائے۔ یہ علاقہ کئی وجوہ کی بنا پر عسکری اہمیت کا حامل تھا۔ دور تک مسلم ریاستوں کا سلسلہ تھا، جن سے بڑی امداد ملنے کی توقع تھی، خود اس علاقہ کی آبادی ایسے قبائل پر مشتمل تھی، جن کی حریت پسندی ضرب المثل۔ لیکن پنجاب کی سکھ حکومت کے ہاتھوں ان کے ناک میں دم تھا۔ پھر بھی وہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے برسرپیکار رہنے کی وجہ سے اپنی قوتوں کو ضائع کرتے رہے تھے۔ ان کو متحدہ و منظم کر کے ایک ایسی عسکری قوت حاصل ہو سکتی تھی۔ جس کے ذریعہ استخلاص وطن کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا۔

زماں شاہ نے اٹھارویں صدی کے آخر میں ہندوستان پر یلغار کر کے پنجاب کے میدانوں کو روند ڈالا تھا اس کے طوفان کو رد کنانہ مرہٹوں کے بس کی بات تھی، نہ تخت دہلی کی۔ اس کے قدم ایک بار دہلی میں جمتے تو انگریزوں کی پیش قدمی کے امکانات معدوم ہو جاتے۔ لیکن اسی دوران افغانستان میں خانہ جنگی شروع کرا دی گئی اور زماں شاہ کو واپس جانا پڑا۔ وہ ۱۷۹۹ء میں واپس جاتے ہوئے رنجیت سنگھ کو پنجاب کی گورنری کا پروانہ لکھ کر دے گیا تھا۔ اس کے زوال کے بعد رنجیت سنگھ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی سکھ اور مسلم ریاستوں کو ختم کر کے بڑی سلطنت قائم کی اور مہاراجا کا لقب اختیار کیا۔ انگریزوں نے اس حکومت کو اپنا حلیف بنا لیا اور اپنی تدبیر گری سے سکھوں کو پہلے سندھیا کے مقابلہ پر کھڑا کر کے مرہٹہ قوت کو کمزور کرایا اور پھر سکھ حکومت کا رُخ شمال کے پٹھانوں کی طرف موڑ دیا۔ تاکہ خود انگریز شمال مغرب کے خطرے سے بے نیاز ہو کر مفتوحہ علاقوں میں اپنی حکومت کو مستحکم کر سکیں۔

حریت پسندوں کے اس قافلے کا پنجاب سے گذر کر سرحدی علاقہ تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے راجستھان کے طویل تر اور دشوار گذار راستے کو اختیار کیا گیا۔ گوالیار کی مرہٹہ ریاست اور ٹونک کی مسلم ریاست میں پذیرائی بھی ہوئی اور امداد بھی ملی۔ دس ماہ کا طویل سفر کر کے کوئٹہ کابل ہوتے ہوئے یہ قافلہ پشاور پہنچا۔ یہ انتظام بھی رکھا گیا کہ وسط ہند کے علاقوں سے کمک اور مالی امداد برابر ملتی رہے

۱۸۲۷ء میں عارضی آزاد حکومت کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ تمام اہل قافلہ نے سید احمد صاحب کو اپنا امیر مقرر کیا اور مختلف شعبہ ہائے نظام کے لئے مختلف افراد کو مقرر کیا گیا۔ تعاون و امداد کے لئے ایران و افغانستان میں

سفارتیں بھیجی گئیں۔ سفیروں کے ذریعے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بھی رابطہ قائم کیا گیا۔ قائدین کے سامنے جہاد حریت سے بھی زیادہ ضروری تنظیم و اصلاح کا کام تھا لیکن یہاں پہنچ کر ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ سکھوں کی فوجوں سے تصادم شروع ہوگیا۔ بے سروسامانی کے باوجود شروع کی گئی جنگوں میں کامیابی ہوئی کافی علاقہ زیر نگیں آگیا۔ عشر کا نظام قائم کرکے مالیات کا بھی انتظام ہوگیا۔ لیکن اس صورت حال سے اصل مقصد دور ہوتا جارہا تھا۔ مختلف والیان ریاست اور خاص طور پر سکھ حکومت کے ذمہ داروں کو جو خطوط اس دوران لکھے گئے ان سے ان حضرات کا عندیہ معلوم ہوتا ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی افواج کے جنرل بدھ سنگھ کے نام خط سے یہ چند سطور ملاحظہ ہوں:

"خدا گواہ ہے ہمارا منشا نہ دولت جمع کرنا ہے، نہ اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔ ہم خدائے بالا و برتر کے ناچیز بندے ہیں، نہ ہندگان خدا پر جبر و قہر کا کوئی وسوسہ ہمارے دل میں ہے اور نہ کسی کی حکومت چھین لینے کا کوئی جذبہ، ہمارا منشا وطن کو آزاد کرانا ہے اور بس۔ اور یہ اس لئے کہ تقاضائے مذہب یہی ہے اور اسی میں رضائے مولا متصور ہے"[1]

سید احمد صاحب کے منشا کی مزید تفصیل اس خط میں ہے جو گوالیار کے مرہٹہ سردار راجہ ہندوراؤ کو لکھا گیا۔ لکھتے ہیں:

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ وہ بیگانے اور اجنبی جو وطن عزیز سے بہت دور کے رہنے والے ہیں، دنیا جہاں کے بادشاہ بن گئے ہیں اور سودا بیچنے والے دوکاندار بادشاہت کے درجے کو پہنچ گئے ہیں بڑے بڑے امیروں کی امارات اور بلند مرتبہ رؤسا کی ریاست کو برباد کردیا گیا ہے اور ان کی عزت اور ان کا اعتماد بالکل ختم کردیا ہے۔ چونکہ وہ لوگ جو ریاست و سیاست کے مالک تھے گوشہ گمنامی میں بیٹھ گئے ہیں ناچار چند بے سروسامان فقیر مرہبت کس کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ کمزوروں کی یہ جماعت محض اللہ کے دین کے تقاضے سے اس خدمت کے لئے کھڑی ہوگئی ہے۔ یہ لوگ جاہ طلب دنیادار نہیں ہے بلکہ مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھ کر اس خدمت کے لئے اٹھے ہیں، مال و دولت کا قطعاً کوئی لالچ نہیں ہے۔ جس وقت ہندوستان کا میدان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہوجائے گا اور ہماری کوششوں کا یہ مراد کے نشانے پر پہنچ جائے گا، حکومت کے عہدے اور منصب ان کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہوں گے اور انھیں کی عظمت و شوکت کی جڑیں مضبوط کی جائیں گی ہم کمزوروں کو بڑے بڑے رؤسا اور بلند مرتبہ عمائدین سے صرف اتنی بات درکار ہے کہ اہل اسلام کو ان کا دلی

[1] بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۱۹۲

تعاون حاصل رہے گا۔ اور مسند حکومت ان کو مبارک ہو۔ ۹؎

اس علاقہ کے بہت سے قبائل، بزرگوں اور خوانین نے سید احمد صاحب کی امارت کو تسلیم کر کے بیعت کی چند ہفتوں کے اندر اندر ہی مجاہدین کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۰؎ سید صاحب کے ساتھ جو لوگ ایک عرصے سے رہ رہے تھے اور ان کے دامن تربیت میں کچھ دن زندگی گذار چکے تھے ان کے اندر للہیت، حق پرستی، صداقت شعاری، اخلاص، رضا بالقضا، صبر و تحمل اور ایثار و قربانی کے جذبات بدرجہ اتم پیدا ہو چکے تھے لیکن ملکی خوانین میں سے سب نے صدق دل سے ساتھ نہیں دیا۔ اس جدوجہد کے پہلے سال ہی درانی سردار یار محمد خاں نے سکھوں سے ساز باز کر کے اس مشن کو ناکام بنانے کا پورا بندوبست کر دیا وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کا باجگذار حاکم تھا۔ بہ ظاہر اپنی آزادی کا اعلان کیا اور سید صاحب کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن اس کی نیت صاف نہیں تھی۔ پہلے عین جنگ کے موقعہ پر سید صاحب کو زہر دلوا دیا۔ لنگڑا ہاتھی ان کی سواری کے لئے مہیا کیا اور پھر جب مجاہدین کو کامیابی حاصل ہو رہی تھی میدان جنگ سے اپنے بیس ہزار کا لشکر کو لے کر فرار ہو گیا جس سے افراتفری مچ گئی۔ اور میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ سخت نقصانات اٹھانا پڑے، اس طرح کی دغا بازیوں کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اس علاقہ کے لوگ حریت پسندی کی اعلیٰ صفت کے باوجود کسی ضبط و تنظیم کے عادی نہ تھے۔ جنگ جوئی ان کی سرشت تھی، لیکن عسکری نظم سے وہ بالکل بیگانہ تھے۔ اسلامی اصولوں پر مبنی عدل و مساوات اور جمہوریت کا جو نظام سید صاحب کرنا چاہتے تھے، وہ نہ ان کی طبیعت سے میل کھاتا تھا نہ ان کی خودغرضیوں کی تسکین کر سکتا تھا۔ بلکہ اس سے ان کے پندار و غرور کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ پھر انگریزوں نے بڑی چالاکی سے مذہبی اشتباہات پیدا کرا دیئے اور بہت سے خوانین اس لشکر مجاہدین سے بدظن ہو گئے، یہاں تک سازش کر کے ایک شب میں تمام علاقہ میں متعینہ منتظمین، عمال و حکام کو قتل کرا دیا گیا۔ اس میں تقریباً چار ہزار جانیں ضائع ہوئیں اور یہ سب ہندوستان سے آئے ہوئے تربیت یافتہ حضرات تھے۔ سید صاحب کے پیغام کی مقبولیت کے باعث قوت میں اضافہ بھی ہوا۔ لیکن ان عوارضات و موانعات کے نتیجہ میں یہ قوت مجتمع ہوئی وہ سب سکھوں کے ساتھ جنگ میں صرف ہو گئی۔ اور جب اہل سرحد کی ان غداریوں سے سخت مردلی اور مایوسی پیدا ہوئی تو سید صاحب نے ان علاقوں سے نکل جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور مخلصین کی جماعت کو لے کر کوچ کیا بھاری آلات جنگ توپ وغیرہ کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب مقصد جنگ کرنا نہیں تھا۔ بلکہ دشوار گذار پہاڑی راستوں سے گذر کر کسی ایسے مقام پر پہنچ جانا تھا جہاں اپنوں کی منافقانہ چالوں اور غداریوں سے محفوظ رہ سکیں، لیکن رہبروں

۹؎ بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۱۹۳ ۱۰؎ ابوالحسن علی ندوی : سیرت سید احمد شہید ج ۲ ص ۵

کی عیاری سے سکھوں کے بڑے لشکر کے درمیان گر گئے۔ اور بالاکوٹ کے مقام پر وہ آخری معرکہ درپیش آیا جس میں ۷ مئی ۱۸۳۱ء کو سید صاحب اور ان کے مخلص مرید مولانا محمد اسمٰعیل اور بہت سے دیگر جانثاروں نے جام شہادت نوش کیا ع خدا رحمت کند بر عاشقان پاک طینت را۔ اور وہ ساری تحریک کا شیرازہ بکھر گیا۔

انگریز کی شاطرانہ چالیں کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ سکھوں نے توسیع سلطنت کے جوش میں اپنی قوتیں پٹھانوں کو زیر کرنے میں صرف کر دیں۔ پٹھان اور حریت پسند مجاہدین سکھوں سے ٹکرا کر ختم ہوئے اور کچھ ہی عرصے بعد پنجاب بھی انگریزوں کے زیر نگیں آ گیا اور صوبہ سرحد بھی، یعنی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی ڈپلومیسی کا یہاں بھی اسی طرح بھرپور مظاہرہ ہوا جیسے ہندوستان کی بہت سی چھوٹی بڑی ریاستوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، شاہ عبدالعزیز کی ہدایت کے مطابق سید احمد صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۵ء تک شمالی ہند کے مختلف علاقوں کے دورے کئے۔ اصلاح رسوم اور تبلیغ دین کے ساتھ عوام الناس میں آزادی کی رُوح پھونکی اس کے نتیجہ میں :

(۱) لوگوں کی بڑی تعداد سید صاحب کے ساتھ ان کی آزاد فوج میں شامل ہو گئی اور یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب سید صاحب سرحدی علاقے میں مصروف پیکار ہو گئے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے اس لشکر میں شامل ہونے والوں کی تعداد کم و بیش آٹھ ہزار بتائی جاتی ہے۔

(۲) مالی امداد بھی ملک کے گوشے گوشے سے حاصل ہوتی رہی۔

(۳) ملک کے مختلف علاقوں میں ایسے افراد تیار ہو گئے جنھوں نے آگے چل کر حریت پسندوں کی تنظیم کو سنبھالا خصوصاً بنگال اور بہار میں ایسے متعدد مراکز بن گئے تھے۔

(۴) ۱۸۳۱ء میں واقعہ بالاکوٹ کے بعد بھی روح آزادی زندہ رہی جس کا نقطۂ عروج ۱۸۵۷ء تھا۔

سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی خدمات کا جائزہ ان کی کامیابیوں کی فہرست تیار کر کے نہیں لیا جا سکتا بلکہ ان اثرات کا جائزہ لینا ہوگا۔ جو ان کی مساعی اور قربانیوں سے پورے ملک میں پیدا ہوئے۔ ان مساعی کا اگر ابتدائی سرا شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے مل جاتا ہے۔ تو آخری سرے پر مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اشخاص کی بڑی تعداد ہے، جن کی زندگیاں آزادی وطن کے لئے قربانیوں کی داستان پیش کرتی ہے۔